دعوت عام کی بنیادیں

خرّم مُرادؔ

منشورات

00030 / 10

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب : دعوتِ عام کی بنیادیں
انتخاب : خرم مراد
طبع اول : فروری ۲۰۰۰ء
تعداد : ۲۰۰۰
طبع دوم : جنوری ۲۰۰۳ء
تعداد : ۱۱۰۰
کوڈ : 00033
ISBN : 978-969-9894-55-8

ناشر منشورات

E-8، منصورہ، ملتان روڈ، لاہور۔ 54790
042-35252210 - 35252211
042-35252194
SMS ur Address:
0332-003 4909, 0320-543 4909
manshurat@gmail.com / @hotmail.com
www.facebook/manshurat
www.pinterest.com/manshurat

مطبع : میسج پریس، بند روڈ، لاہور۔

قیمت : ۱۳روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عوام کو منظّم کرنے اور اپنے ساتھ لے کر چلنے کی جو تدبیر ہم نے اختیار کی ہے، یہ اسی حکمت عملی کا تسلسل ہے جو سارے انبیا کرام نے اختیار کی۔ جماعت اسلامی نے شروع ہی میں اس بات کو واضح کر دیا تھا کہ بالآخر ہمیں رائے عامہ سے، عوام کی تحریک سے، اور عوام کی قوت کو جمع کر کے یہ تبدیلی لانا ہے۔ دوسرے ذرائع خواہ وہ اسلحہ ہو یا مظاہرے یا اس قسم کی دیگر تدابیر، اپنے استعمال کے لیے بہت سی شرائط کے طالب ہیں۔ لیکن تبلیغ اور دعوت سے رائے عامہ کو ہموار کرنا، قوت بنانا اور اس کو ساتھ لے کر چلنا، یہ انبیائے کرام کی ابتدا ہی سے حکمت عملی رہی ہے اور یہی جماعت اسلامی نے طے کیا تھا۔ اگر چہ اس پر عمل درآمد کی صورتیں حالات کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہیں۔

عامتہ الناس کو منظّم کر کے اپنے ساتھ لے کر چلنا، بہت پرخطر کام ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ دین اور ایمان کے لیے جتنا خطرہ اس میں ہے، اتنا کسی اور کام میں نہیں۔ اسی لیے بہت سے لوگ جن بے شمار خدشات اور اندیشوں کا اظہار کرتے ہیں وہ بے بنیاد نہیں ہیں، وہ واقعی خطرے ہیں اور اپنی جگہ ایک حقیقت ہیں۔ ان خطرات و خدشات کی طرف انبیا نے بھی ابتدا ہی سے توجہ دلائی ہے۔ ملت اسلامیہ کے صلحا، علما اور دیگر اکابر بھی اس طرف توجہ دلاتے رہے ہیں کہ یہ بڑا پُرخطر کام ہے۔ اس کے اندر نفس کے لیے، دین کے لیے اور ایمان کے لیے جو خطرات پوشیدہ ہیں وہ بہت بڑے خطرات ہیں۔ نفس کے لیے مال سے بڑھ کر فتنہ جان کا ہوتا ہے۔ طلب اور شہرت کی خواہش، دو انسان کسی کے پیچھے چلنے لگیں تو کبر کا جذبہ اور اپنی ذات کے لیے کچھ حاصل کرنے کا جذبہ، بڑی آسانی کے ساتھ شیطان دلوں کے اندر پیدا کر دیتا ہے۔ ایک

لاکھ روپے جمع کرنے سے آدمی کو وہ خوشی اور افتخار حاصل نہیں ہوتا جو لوگوں کے دل کو موہ لینے اور افراد کو اپنے ساتھ لے کر چلنے سے حاصل ہوتا ہے۔ جب دو آدمی کہنا ماننے لگیں تو اس سے آدمی کو اپنے مقام کا احساس ہوتا ہے، اور اس مقام و مرتبہ کے لیے اس دنیا میں کیا کچھ جھگڑے نہیں ہوتے۔ لوگ ہمارے پیچھے چلیں اور ہمارے ساتھ ہوں، پیروں میں، علما میں اور سیاسی لیڈروں میں، ہر جگہ یہ خواہش سب سے بڑی ہوتی ہے۔ اسی لیے انبیا کا طریقہ کار بڑا پُر خطر اور پُر عزم طریقہ کار ہے۔

تصوف اور وظائف کا طریقہ تو نسبتاً آسان طریقہ ہے کہ آدمی ایک گوشے میں بیٹھ جائے، توجہ حاصل کر لے اور اذکار میں مشغول ہو جائے، اپنے نفس کا تزکیہ کرے، اللہ کا قرب حاصل کرے اور اس کی ذات میں فنا ہو جائے۔ لیکن اللہ کی ذات سے ربط قائم کر کے، اس کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ کے، ''اعتصام باللہ'' کے ساتھ آدمی عوام اور مخلوق خدا کی طرف رخ کرے، ان کو اپنے مقصد اور نظریے کے پیچھے جمع کرے اور ان کی قوت کو اپنے ہاتھ میں لے لے اور اس کا استعمال کر کے تاریخ کا رخ بدل ڈالے، یہ کام بڑے عزم و حوصلے اور صبر و محنت کا طالب ہے۔ جو یہ کہتے ہیں کہ نہیں، یہ صبر اور محنت سے فرار کی راہ ہے تو وہ نہیں سمجھتے کہ دراصل کیا چیز پیش نظر ہے۔ یہ انبیا کی راہ ہے، بڑے عزم و ہمت اور صبر و استقامت کی راہ ہے۔

ہمارا سارا لٹریچر جو تزکیۂ نفس کے موضوع پر پایا جاتا ہے، اس میں دو چیزوں یعنی ''طریقہ ولایت'' اور ''طریقہ نبوت'' کا ذکر آیا ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی تصانیف میں ان کا ذکر کیا ہے۔ ''طریقہ ولایت'' یہ ہے کہ آدمی اپنا تزکیہ کر لے اور کسی گوشے میں بیٹھ کر اپنی اصلاح کر لے۔ اس میں یہ نہیں ہوتا کہ آدمی کسی گوشے میں بیٹھ رہے، خوب عبادت کرے اور اللہ کی ساری نعمتوں سے فائدہ اٹھاتا رہے۔ بلاشبہ دین میں ''طریقہ ولایت'' کا اپنا ایک مقام ہے اور یہ بھی بڑی ہمت کا کام ہے لیکن لوگوں میں رچ بس کر رہنا اور پھر اصلاح کی کوشش کرنا، یعنی ''طریقہ نبوت'' اپنانا، بڑا کٹھن کام ہے۔

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ ایک جگہ نقل کرتے ہیں کہ شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ جو بہت عظیم صوفیا میں سے تھے، انھوں نے کہا کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم ساتویں آسمان پر اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچ گئے اور واپس آ گئے۔ اگر میں وہاں جاتا تو ہرگز واپس نہ آتا۔ یہ لکھ کر علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ نبوت کے مزاج اور تصوف کے مزاج میں دراصل یہی فرق ہے۔ تصوف کا تو منتہا ہی یہی ہے کہ وہ حق میں فنا ہو جائے، اور حق کو پا کر اسی میں گم ہو جائے۔ لیکن نبی تو حق کو پا کر واپس آتا ہے اور تاریخ کے دھارے میں اپنے آپ کو جھونک دیتا ہے۔ تاریخ ساز قوتوں کو اپنی مٹھی میں لے کر پھر ایک نئی تاریخ تشکیل دیتا ہے جس سے رہتی دنیا تک انسانیت فائدہ اٹھا سکے۔ یہی فرق ہے ''طریقہ ولایت'' اور ''طریقہ نبوت'' میں۔ لوگ اس کام کو آسان کام سمجھتے ہیں۔ یہ کوئی شارٹ کٹ یا اقتدار کی ہوس نہیں ہے بلکہ یہ کار انبیا ہے اور منصب نبوت صلی اللہ علیہ وسلم کا تقاضا ہے۔

دعوت کے اس کام کو کرنے کے لیے لوگ انبیا کے طریقہ کار کا نام بھی بار بار لیتے ہیں۔ انبیا کے طریقہ کار میں کچھ اصولی باتیں ہیں اور کچھ تدابیر۔ تدابیر مختلف انبیا کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام نوسو سال تک پکارتے رہے: وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ (ھود ۱۱:۴۰) ''اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو نوح کے ساتھ ایمان لائے''۔ یہ دعوت عام کا ایک طریقہ تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نکلے تو اپنی پوری قوم کو ساتھ لے کر نکلے۔ انھوں نے یہ نہیں دیکھا کہ یہ غلام تھے، ان کی ذہنیت اور نفسیات میں غلامی رچ بس چکی تھی۔ ان کا عقیدہ اور ایمان اس حد تک خراب تھا کہ فرعون سے نجات پاتے ہی مطالبہ کر دیا کہ اے موسیٰ علیہ السلام! پرستش و پوجا کے لیے ہمیں کوئی معبود بنا دیجیے۔ بات بات پر جھگڑتے اور اعتراض کرتے تھے اور یہ شکایت بھی کرتے تھے کہ ہم فرعون کے ساتھ بڑے آرام سے تھے۔ تم خواہ مخواہ ہم کو وہاں سے نکال لائے۔ یہ آزادی ہم کو نہیں بھاتی۔ دعوت کا یہ ایک انداز تھا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کا اپنا ایک انداز تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دعوت کے لیے ایک حکمت عملی اپنائی۔

دعوت کے ان مختلف طریقوں میں کچھ چیزیں بنیادی اصولوں کی حیثیت رکھتی ہیں جن کو ہمیشہ سامنے رہنا چاہیے۔ پہلے بھی یہ سامنے رہی ہیں مگر ان کی تذکیر ضروری ہے۔

اعتصام باللہ

سب سے پہلی چیز ''اعتصام باللہ'' ہے۔ اس سے مراد اللہ کو مضبوطی کے ساتھ پکڑنا اور تھامنا ہے۔ وَمَنْ یَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ(اٰل عمرٰن ۳:۱۰۱) ''جس نے اللہ کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا اسی کی سیدھا راستہ دکھا دیا گیا''۔ صراط مستقیم پر چلنے کا دوسرا کوئی اور طریقہ نہیں ہے۔ قرآن مجید میں جہاں اللہ تعالیٰ نے جہاد کا حکم دیا اور فرمایا کہ اللہ نے تم کو منتخب کیا ہے، اور ابراہیم علیہ السلام کی اُمت میں داخل کیا ہے اور اُمت مسلمہ تمھارا نام رکھا ہے، وہاں پہلی ہدایت یہی تھی: وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ط(الحج ۲۲:۷۸) ''اور اللہ کو مضبوطی کے ساتھ تھام لو''۔ یہ وہ زادراہ ہے کہ جس کے بغیر کوئی راستہ بھی طے نہیں ہوتا۔ تدابیر تو بہت سی اختیار کی جاسکتی ہیں لیکن اللہ کو مضبوطی کے ساتھ تھامے بغیر یہ کام نہیں ہوسکتا۔

اللہ کو مضبوطی کے ساتھ تھامنے کے بھی کچھ طریقے ہیں۔ مثلاً اذکار و اوراد، نفلی عبادات اور انفاق وغیرہ۔ مگر اصل چیز تو اللہ پر بھروسا اور اللہ پر ایمان ہے۔ یہی اعتصام کے معنی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کو آپ کے سامنے وضاحت سے بیان کروں۔ ان سب طریقوں میں سے سب سے بڑھ کر اسی زادراہ کی ضرورت ہے۔

اصل چیز اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ یقین اور ایمان ہے کہ اس پوری کائنات میں اختیار اور تصرف اس کی مٹھی میں ہے اور کسی دوسرے کو شمہ برابر بھی اختیار حاصل نہیں ہے۔ اس کے اذن کے بغیر کوئی پتا نہیں ہل سکتا اور نہ کوئی ذرا اپنی جگہ سے حرکت کرسکتا ہے۔ جو پتا اس کی مرضی کے بغیر ہل جائے وہ تو خود خدا ہو جائے گا اور اس کی خدائی سے باہر جائے گا۔ اجازت نہ ہو اور پتا ہل جائے، یہ اس کائنات میں نہیں ہوسکتا۔ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ (السجدہ ۳۲:۵) ''آسمان سے زمین تک سارے امر کی تدبیر وہی کرتا ہے''۔ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ (البقرہ ۲:۲۵۵) ''اسی کے لیے ہر چیز جو آسمان اور زمین میں ہے''۔ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (التوبۃ ۹:۱۱٦) ''اسی کی بادشاہت ہے آسمان و زمین

میں‘‘۔ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ج (البقرہ۲:۲۵۵) ’’اس کی کرسی کے نیچے آسمان وزمین ہیں‘‘۔ ’’کرسی‘‘ کے معنی ہیں کہ کوئی چیز اس کے اقتدار سے باہر نہیں۔

تاریخ کی کوئی کروٹ ہو، لیل ونہار کی کوئی گردش ہو، قوموں کا عروج و زوال ہو، اسمبلیوں کا ٹوٹنا اور بننا ہو، غرض کوئی چیز بھی اس کے اذن کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ درحقیقت یہی توحید کو روح ہے۔ یہ نہیں کہ اللہ کو مان لیا کہ وہ ہے اور اس کے آگے سجدہ کرلیا۔ اس طرح سے اللہ کو ماننے والے تو بے شمار ہیں۔ ایک، مان لینا اور سجدہ کر لینا کوئی بڑی بات نہیں۔ اصل تو یہ تصور ہے کہ اختیار اس کے پاس ہے، حکم صرف اس کا چلتا ہے، دلوں کو کوئی نہیں بدل سکتا، نہ کوئی آنکھ دیکھ سکتی ہے اور نہ کوئی کان سن سکتا ہے، اور نہ کوئی دل دھڑک سکتا ہے، غرض کوئی حرکت نہیں ہوسکتی، اگر اللہ نہ چاہے۔ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ (یونس۱۰:۳۱) ’’یہ سماعت اور بینائی کی قوتیں کس کے اختیار میں ہیں؟‘‘ رات کو لمبی کر کے کون دن لا سکتا ہے اور دن کو لمبا کر کے کون رات لا سکتا ہے؟ کون پیدا کرتا ہے؟ کون آسمان سے پانی برساتا ہے؟ یہ سب باتیں قرآن مجید میں ایک تواتر سے آتی ہیں۔ یہی توحید کی روح ہے۔ سب چیزیں اسی نے پیدا کی ہیں۔ اختیار صرف اس کا ہے۔

دنیا میں خدا کا انکار تو شاذ و نادر ہی کیا گیا ہے۔ آج بھی ۹۳ فی صد امریکی خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ ۸۰ یا ۹۰ فی صد لوگ اللہ کو مانتے ہیں۔ جہاں بھی چلے جائیں خواہ ہندو ہوں یا بدھ، سب کسی نہ کسی طرح خدا کو مانتے ہیں۔ لیکن خدا بااختیار ہے، یہ نہ ماننے کا چلن عام ہے۔ اسی لیے جہاں اللہ تعالیٰ نے تخلیق کا ذکر کیا ہے، وہاں یہ فرمایا: اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ قف (الاعراف۷:۵۴) ’’درحقیقت تمھارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر اپنے تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہوا‘‘۔ اس کے بغیر بات مکمل نہیں ہوتی۔ خالق کو ماننے والے تو سب ہیں کہ خالق ہے، لیکن یہ کہ وہ عرش پر بیٹھا ہوا ہے، اقتدار اس کے پاس ہے، تخت حکومت پر وہ جلوہ افروز ہے، اور اس کی مٹھی میں ساری چیزیں ہیں، یہ بات ماننے والے بہت کم ہیں۔ اس سے

صحیح معنوں میں خدا پر ایمان مکمل ہوتا ہے۔ ہر جگہ یہی سب سے بڑا مسئلہ رہا ہے۔

جدید دنیا کا بھی یہی مسئلہ رہا ہے۔ نیوٹن نے ایک سیب گرتے دیکھا۔ سیب کو گرتے ہوئے دیکھ کر اس نے کہا کہ دنیا میں سب چیزیں کشش ثقل پر تھمی ہوئی ہیں۔ نیوٹن بڑا پکا عیسائی بلکہ موحد (unitarian) تھا اور عیسائیت میں موحد طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ جب اس نے کتاب لکھی تو اس کا خیال تھا کہ اس سے مذہب کو بڑی تقویت ملے گی۔ لیکن اس کتاب نے تو مذہب کی جڑ کاٹ دی۔ لوگوں نے اس سے نتیجہ یہ نکالا کہ ہاں، خدا نے پیدا ضرور کیا ہے مگر اب وہ زمین و آسمان کو تھامے ہوئے نہیں ہے بلکہ اب یہ خود بخود قدرت کے قانون پر قائم ہے۔ چنانچہ گھڑی ساز خدا کا عقیدہ یورپ میں سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں آیا۔ جس طرح گھڑی ساز گھڑی بناتا ہے اور گھڑی چلانے کے لیے گھڑی ساز کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ گھڑی خود بخود چلتی رہتی ہے، اسی طرح خدا بھی ہر چیز سے بے دخل ہو گیا ہے، سیاست سے بھی، معیشت سے بھی، اور انسان کی تخلیق سے بھی۔ یہ چیز جہاں ہے وہاں بدترین سیکولرازم اور بدترین ثنویت ہے اور خدا کو بے اختیار اور بے دخل کر دیا گیا ہے۔ آج مادہ پرستی اور اسباب پرستی کا جو سیلاب ہے، اسی فکر کا نتیجہ ہے۔ ہم سب اس سے متاثر ہیں۔

ہمیشہ سے انسان اس فکر سے متاثر رہا ہے۔ وہ اسباب کو دیکھتا ہے تو سمجھتا ہے کہ یہی سب کچھ کر رہے ہیں۔ ایمان میں آزمایش یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو پردے میں چھپا لیا ہے۔ وہ کچھ کرتا دکھائی نہیں دیتا۔ بارش آتی ہے، سب بتا سکتے ہیں کہ کس طرح بادل آئے، اور بارش ہوئی مگر کہیں خدا کی ضرورت نہیں پڑتی۔ زلزلہ آتا ہے، قومیں تباہ ہوتی ہیں مگر خدا کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ انسان پیدا ہوتا ہے مگر خدا دکھائی نہیں دیتا۔ اس نے پردے کے اندر اپنے آپ کو محصور کر لیا ہے اور چھپا لیا ہے۔ اس پردے کو چیر کے دیکھ لینا کہ ہاں، وہ موجود ہے اور اس پر یقین رکھنا، یہی دراصل پوری ہدایت کی بنیاد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کا آغاز کیا تو ہدایت کے بعد پہلی بات یہ کہی کہ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ (البقرہ ۲:۳) یعنی وہ لوگ جو غیب پر ایمان

رکھتے ہیں وہی ہدایت پا سکتے ہیں۔ مگر آدمی مجبور نہیں، چاہے تو انکار کرسکتا ہے۔ یہ انسان کے امتحان کا تقاضا تھا۔

اگر خدا اس طرح روشن ہوتا جس طرح آسمان پر سورج، تو ہر آدمی مان لینے پر مجبور ہوتا۔ ماننے پر مجبور تو پہاڑ بھی ہیں اور چاند بھی، ستارے بھی ہیں اور فرشتے بھی، مگر انسان مجبور نہیں ہے۔ اس لیے کہ خدا اس کی آنکھوں سے اوجھل کر دیا گیا ہے۔ اگر وہ کہے کہ خدا نہیں ہے، خدا پانی نہیں برساتا، خدا پیدا نہیں کرتا، خدا رات اور دن کا مالک نہیں ہے، اس کا حکم نہیں چلتا، تو وہ کہہ سکتا ہے۔ کوئی عقل یا تجربہ ایسا نہیں ہے جو اس کو ثابت کر دے کہ خدا ہے۔ ثابت ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر ثابت ہو جائے تو انسان کا امتحان ختم ہو جائے۔ یہی دراصل وہ چیز ہے جو ہماری اساس اور ایمان کی بنیادی ہے۔ یہ ایمان بالغیب ہے جس پر پورے دین کی عمارت تعمیر ہے۔ میں تفصیل میں اس لیے گیا ہوں کہ ہماری دعوت، ہمارے عزم اور ہماری قوت پر اس چیز کے بہت گہرے اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔

انبیائے کرام علوم غیب پہنچانے آتے ہیں۔ ظاہری علوم مثلاً سائنس اور طب یہ آدمی اپنی عقل سے خود جان سکتا ہے۔ لیکن وہ علوم جو انسان قطعیت کے ساتھ اپنی عقل سے نہیں پرکھ سکتا وہ ہیں جو انبیا پہنچاتے ہیں۔ اللہ موجود ہے، موت کے بعد اس کو جواب دینا ہے، گو کوئی چیز نگاہوں کے سامنے نہیں آتی لیکن اس پر یقین کہ ہر جگہ اسی کا ہاتھ کام کر رہا ہے، یہ دراصل توحید کی روح ہے۔ اسی وجہ سے لاحول و لاقوۃ الا باللّٰہ کو عرش کے خزانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ عرش تو مرکز سلطنت ہے اور عرش کے خزانوں میں یہی سب سے بڑا خزانہ ہے کہ کسی کے پاس کوئی قوت نہیں ہے سوائے اللہ کے (مَاشَآءَ اللّٰهُ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ) اور جو اللہ چاہے گا وہی ہوگا۔

اس بات کی اہمیت کے پیش نظر اس تصور کو ہر وقت تازہ رکھنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ مثلاً نماز ختم کرو تو اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ (جس کو تو دے کوئی روک نہیں سکتا اور جس کو تو نہ دے کوئی دے نہیں سکتا) پڑھو۔ حضور ﷺ ہر نماز کے بعد پڑھتے تھے۔

صبح اٹھنے کے بعد جو دُعا آپ ﷺ نے سکھائی ہے: **مَاشَآءَ اللّٰهُ كَانَ وَمَالَمْ يَشَآءَ لَمْ يَكُنْ** (جو اللہ چاہے وہ ہوگا اور جو اللہ نہ چاہے وہ نہیں ہوگا)، اس میں بھی اسی بات کی تعلیم ہے۔ کل کے لیے یہ مت کہو کہ یہ ہو جائے گا بلکہ **اِلَّا اِنْ يَّشَـآءَ اللّٰـهُ** کی تعلیم دی گئی ہے۔ ہر ہر قدم پر اسی چیز کی تعلیم دی گئی ہے تاکہ کہیں بھی یہ سوچ جڑ نہ پکڑ سکے کہ اللہ کے چاہے بغیر بھی کچھ ہوسکتا ہے۔

یہ دراصل ایمان بالغیب ہے۔ ایمان بالغیب میں تو اور بھی چیزیں ہیں مثلاً جنت اور دوزخ، لیکن میں یہ پہلو اس لیے لے رہا ہوں کہ یہ ''اعتصام باللہ'' ہے۔ اس کی روح یہ ہے کہ اللہ کو مضبوطی سے پکڑ لو کہ ساری قوت اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے حکم کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔ چونکہ اسباب نظر آتے ہیں، ''مسبب'' اور رب نظر نہیں آتا، اس لیے آدمی سبب کو رب بنا لیتا ہے۔ کبھی چاند کے آگے جھکتا ہے اور کبھی ستارے کے آگے۔ کبھی گائے کے آگے جھکتا ہے جو دودھ دیتی ہے، مگر جس نے دودھ سینے میں اتارا اس کے آگے نہیں جھکتا کیونکہ وہ نظر نہیں آتا۔ اسی طرح ہم مختلف چیزوں کے مادی اسباب وعلل پر بحث کرتے رہتے ہیں کہ یہ یوں ہوا اور وہ یوں ہوا۔ بلاشبہ مادی اسباب کو ضرورت سمجھنا چاہیے اور تمام ممکنہ تدابیر اختیار کرنی چاہییں لیکن بالآخر ذہن کو اس بات پر مطمئن ہونا چاہیے کہ اصل سبب تو رب ہے۔ وہ مسبب ہے، وہی رب العالمین ہے، وہی **رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** ہے، اسی کے کرنے سے سب کچھ ہوتا ہے اور اس کے نہ کرنے سے کچھ نہیں ہوسکتا۔

یہ چیز جتنی زیادہ حاصل ہوگی اتنی ہی زیادہ قوت پیدا ہوگی۔ جتنا زیادہ اس بات پر پختہ یقین ہوگا، اتنا ہی زیادہ ایمان قوی اور راہ خدا میں استقامت پیدا ہوگی۔ اس کے بعد پھر خواہ کتنی ہی بڑی تعداد میں لوگ تحریک میں شامل ہو جائیں آپ گمراہ نہیں ہوں گے۔ کتنے ہی لوگ آپ کی تعریف کریں، آپ پر کوئی اثر نہیں پڑے گا اس لیے کہ آپ جانتے ہیں کہ کسی کی تعریف سے کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا۔ **اَللّٰهُـمَّ لَا مَـانِـعَ لِمَا اَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ** (جس کو تو دے کوئی روک نہیں سکتا اور جس کو تو نہ دے کوئی دے نہیں سکتا)۔ کسی کے پاس دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اگر کوئی چند دانے یا چند سکے بھی کسی دینا چاہے تو نہیں دے سکتا تو پھر کسی کی

تعریف سے کیا فرق پڑے گا۔ ایسے میں آزمایشیں آئیں گی بھی تو تربیت کا ذریعہ بنیں گی اورمزید پختگی کا باعث ہوں گی، نیز لوگوں کو ساتھ لے کر چلنے کی قوت بھی پیدا ہوگی۔

صحابہ کرامؓ میں یہی قوت تھی جس کے بل پر ساری سلطنتیں اس کے آگے سرنگوں ہوگئیں۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ سب بڑے عبادت گزار اور تہجد گزار تھے۔ وہ تجارت کرتے تھے، کاروبار کرتے تھے، شادیاں کرتے تھے اور بال بچے دار تھے۔ ان کی زندگی دنیا والوں سے مختلف نہیں تھی سوائے اس کے کہ وہ اللہ کے فرائض کے پابند تھے، اور اس کے محرکات سے اجتناب کرتے تھے۔ البتہ انھیں اپنے اللہ پر کامل یقین تھا جس کے بل پہ وہ قیصروکسریٰ تک کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے تھے۔ اُن کے نزدیک اِن کی حیثیت پتلیوں اور مٹی کے گھروندوں سے زیادہ نہیں تھی۔ انھیں کسی قسم کا کوئی خوف نہیں تھا۔ بادشاہ کے دربار میں نیزے سے قالین کو چاک کرتے ہوئے پہنچ جاتے تھے اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے تھے۔ عرب کے ان بدووں اور معمولی انسانوں میں یہ قوت اس لیے پیدا ہوگئی تھی کہ وہ اللہ کی قوت پر یقین رکھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ رب تو بس ایک ہے باقی سب اسباب ہیں، اور تمام اسباب اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ ان کا اس بات پر یقین تھا کہ کام اسباب سے نہیں بنتا بلکہ رب کے چاہنے یا نہ چاہنے سے بنتا ہے۔

یہ وہ چیز ہے جو ''اعتصام باللہ'' میں پوشیدہ ہے۔ اس کو آپ جتنا حاصل کریں گے، اس پر جتنا آپ کا یقین بڑے گا، یہ جتنا آپ کی گفتگو کا حصہ بنے گا، اتنا ہی مفید ہوگا اور تقویت ایمان کا باعث بنے گا۔ ماشاءاللہ، ان شاءاللہ، یہ سب جملے کیا ظاہر کرتے ہیں؟ یہ اسی چیز کی تائید میں ہیں اور ہماری تہذیب وتمدن اور سوچ وفکر میں رچ بس گئے ہیں۔ یہ ہمارے ہاں جزوکلام بن گئے ہیں مگر اب ہم ان کے معنی کھو چکے ہیں اور ان کا اثر بھی کھو چکا ہے۔

مائیں بچپن میں کہانیاں سناتی تھیں کہ ایک تھا بادشاہ اور ہمارا تمھارا خدا بادشاہ ...... مسلمان بچوں کی کہانی یہاں سے شروع ہوتی تھی۔ مجھے بھی یاد ہے کہ ہماری والدہ کہانی سناتی

تھیں تو کہا کرتی تھیں کہ ہمارا تمھارا بادشاہ اللہ۔ بادشاہ تو بہت سے نظر آئیں گے مگر اصل بادشاہ تو اللہ ہے۔ اس کا مقصود یہ تصور تھا کہ بادشاہ کے معنی بااختیار ہستی کے ہیں۔ وہ صرف عبادت یا پرستش کے لیے نہیں ہے بلکہ اختیار، ملکیت، ساری چیزیں وہی دیتا ہے۔

''اعتصام باللہ'' کی تحریک کے لیے کیا اہمیت ہے؟ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ تحریک میں کام کرنے کے لیے، کام کو آگے بڑھانے اور وسعت دینے کے لیے، اگلے مرحلے میں لے جانے کے لیے، بڑی بڑی قوتوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کے لیے، اور بلاخطر لوگوں کو اپنے پاس جمع کرنے، ان کی رہنمائی کرنے، اور اپنے آپ کو سارے فتنوں اور خطرات سے بچانے کے لیے اس کی بہت ضرورت ہے۔ فتنے تو پھر بھی ہوں گے مگر جب آدمی یہ سمجھ لے گا کہ میں بالکل اپنے رب کی مٹھی میں ہوں، میرے کرنے سے کچھ نہیں ہوگا، جو ہوگا اس کے کرنے سے ہوگا تو پھر وہ پریشان نہیں ہوگا اور حالات سے گھبرا کر مایوسی کا شکار نہیں ہوگا۔

اس بات کی اہمیت کے پیش نظر اللہ نے اس کی بار بار تاکید کی ہے۔ غزوۂ بدر کی پہلی فتح ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے فوراً بتا دیا کہ تم نے قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے قتل کیا، اور تم نے مٹھی بھر خاک نہیں پھینکی تھی بلکہ اللہ نے پھینکی تھی۔ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ص وَ مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ج (الانفال ۸:۱۷) ''پس حقیقت یہ ہے کہ تم نے انھیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو قتل کیا اور اے نبی ﷺ تو نے نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا''۔ گویا پہلے ہی قدم پر، پہلی فتح کے بعد بالکل واضح کر دیا کہ یہ نہ سمجھنا کہ تمھارے کرنے سے کچھ ہوا۔ لیکن اس کے باوجود اپنی تمام تر کوشش کرنے اور تمام ممکنہ وسائل کی فراہمی کا بھی حکم دیا کہ تلوار بھی اٹھاؤ، لڑو بھی اور تدبیر بھی کرو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو اس امر میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ ان پر واضح تھا کہ کرنا سب کچھ ہے لیکن سمجھنا یہی ہے کہ سب اللہ نے کیا ہے۔ پھر یہ سب کچھ اس لیے کرنا ہے کہ اللہ کی مدد شامل حال ہو۔ اللہ کی مدد حاصل ہوگی تو دنیا ہماری ہوگی۔ ان دونوں کے درمیان ایک باریک

سا ربط ہے۔ سب کچھ ہو مگر اللہ کی مدد شامل حال نہ ہو تو کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔

جب یہ ربط ذہن میں قائم ہو جائے تو پھر ''اعتصام باللہ'' کی نعمت حاصل ہوتی ہے۔ ''اعتصام باللہ'' ہی قوت کا اصل سرچشمہ ہے۔ پھر لوگ نعرے لگائیں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لوگ جمع ہو جائیں تو آدمی نہیں بھاگتا۔ تعریف ہوتی ہے تو اس سے نفس میں کوئی خلل نہیں پیدا ہوتا۔ لوگ حضور ﷺ کے سامنے آپ ﷺ کا تھوک زمین پر نہیں گرنے دیتے تھے، آپ ﷺ کے بال لے لیتے تھے اور انھیں سنبھال کر رکھتے تھے، وضو کا پانی لے کر منہ پر مل لیتے تھے مگر حضور ﷺ کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ آپ ﷺ بھی انسان تھے۔ سب کی طرح شیطان کے ساتھ بھی لگا ہوا تھا، مگر آپ ﷺ کی نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اس لیے کہ جو کچھ ہوتا ہے اللہ کی تائید سے ہوتا ہے، جو کچھ ملتا ہے اسی سے ملتا ہے، اور جو کچھ ہے اسے اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ دراصل ''اعتصام باللہ'' کے اندر یہ سوچ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ دعوت اور تحریک کا کام کرتے ہوئے قوت کا یہ سرچشمہ جتنا زندہ رہے گا، جتنی زیادہ اس کو تقویت پہنچائی جائے گی، اتنا ہی خطرات سے بچ نکلنے کے امکانات بڑھتے جائیں گے۔ ان شاء اللہ!

یہ نہیں ہوگا تو ایک فقیر جھونپڑی میں بیٹھ کر بھی فتنے کے اندر مبتلا ہو سکتا ہے۔ اگر ایک آدمی ہزاروں اشرفیوں میں کھیل رہا ہو، تخت شاہی پر بیٹھا ہو، اور وہ یہ سمجھتا ہو کہ یہ سب اللہ کا دیا ہوا ہے، سب اس کے کرنے سے ہوتا ہے، دل اسی سے لگا ہوا ہو، تو وہ ولی اللہ ہے۔ اس کے مقابلے میں اگر ایک فقیر جھونپڑی میں بیٹھا ہو، اس کے پاس دو پیسے ہوں مگر اسی میں دل اٹکا ہوا ہو، بار بار گنتا اور شمار کرتا ہو تو وہ دنیا پرست ہے۔ درحقیقت اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ لوگ آپس میں جمع ہیں یا نہیں ہیں، لوگ اچھی طرح رہتے ہیں یا نہیں رہتے ہیں، اچھا کھاتے ہیں یا نہیں کھاتے ہیں، فرق تو اس سے بنتا ہے کہ دل کہاں اٹکا ہوا ہے، قوت کا منبع اور سرچشمہ کس کو سمجھتے ہیں؟ یہ دراصل ''اعتصام باللہ'' ہے۔

حنیفیت

''اعتصام باللّٰہ'' کے بعد پھر اللہ تعالیٰ نے ''حنیفیت'' کا مطالبہ کیا ہے۔ ''حنیفیت'' سے کیا مراد ہے؟ قرآن مجید میں ایک جگہ نہیں بلکہ بیسیوں جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ کا حنیف کہا گیا ہے۔ دین کے لیے ''حنیف'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ مسلمانوں سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ حنیف بن جاؤ۔ اسلام کے ابتدائی دور میں سود، شراب کی حرمت اور دیگر تفصیلی احکامات نہیں دیے گئے بلک سب سے پہلا مطالبہ یہ کیا گیا تھا کہ اللہ کے لیے حنیف بن جاؤ۔ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ حُنَفَآءَ (البینۃ۹۸:۵) ''اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں، اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے، بالکل یک سو ہو کر''۔

یہ وہ بنیادی مطالبہ تھا جو مسلمانوں سے کیا گیا تھا۔ ''حنیف'' کا لفظ قرآن میں بار بار آتا ہے۔ ''حنیف'' کا ترجمہ ہمارے اردو مترجمین نے طرح طرح سے کیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ سب سے بڑھ کر اللہ کے لیے یکسو ہو جانا اور بعض نے کہا ہے کہ اللہ کا ہو رہنا۔ شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کا بڑا خوبصورت اور مختصر ترجمہ ہے کہ اللہ کے ہو رہو۔ گویا اللہ کے بن کے رہو، اسی کے بن جاؤ۔ اس میں ابھی عمل کا مطالبہ نہیں آتا۔ یہ تو پوری شخصیت، پوری ذہنیت اور بنیادی سوچ کی تعمیر کا عمل ہے۔

''حنیفیت'' کا مطالبہ بار بار کیا گیا ہے۔ اللہ نے خود کہا ہے کہ سب سے آسان دین تو دین حنیف ہے جو اللہ کو محبوب ہے۔ اس ضمن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مثال کو بطور خاص پیش کیا گیا ہے۔ مگر مقصود و مطلوب صرف اللہ کا ہو رہنا ہے۔ ''حنیفیت'' بھی ''اعتصام باللّٰہ'' کے اندر شامل ہے۔ اس لیے کہ اللہ کو تو وہی بندہ قبول ہے جو پورے کا پورا اس کا ہو جائے۔ اس کے بعد گناہ، غلطیاں اور خامیاں ہونا، یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ انسان تو صفاتی مخلوق ہے۔ اگر وہ گناہ نہ کرتا تو اللہ کوئی دوسری ایسی مخلوق پیدا کرتا جو گناہ کرتی اور گناہ سے دل شکستہ ہو کر اس کی بنتی،

اسی کی ہو کر رہتی، اسی کی طرف رجوع کرتی اور اس کے در پر جا کر ہاتھ پھیلاتی۔ جو غلطیوں سے مبرا اور خطاؤں سے پاک ہیں اور ویسے ہی اس کے آگے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہیں مثلاً سورج، چاند، ستارے، فرشتے...... وہ اس کو اتنے محبوب نہیں ہیں۔ اس کو تو وہ محبوب ہے جو گناہ کر سکتا ہو اور نہ کرے، اور اگر گناہ ہو جائے تو اس کی طرف پلٹے، رجوع کرے اور توبہ کرے۔ یہ صرف انسان کی خصوصیت ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ آدمی صرف اس کا بن جائے اور اسی کا ہو رہے۔ جب ایسے لوگ پیدا ہو جائیں گے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ خدا دنیا کی پوری عنان ان کے ہاتھ میں تھما دے گا۔ درحقیقت وہ لوگ چاہییں جو صرف اسی کے بن جائیں اور اسی کے ہو رہیں۔

جب یہ دو چیزیں ذات کا حصہ بن جائیں اور تحریک کے کام میں شامل ہو جائیں تو پھر یہ یقین پیدا ہوتا ہے کہ جو کچھ ہے وہ اللہ ہی کا ہے۔ اگر منہ میں نوالہ ہے تو وہ اپنے ہاتھ سے رکھ رہا ہے۔ اگر پانی ٹھنڈا ہے اور پی رہا ہے تو وہ اسے پلا رہا ہے۔ اگر مرض سے صحت یابی ہوگئی تو ڈاکٹر کی دوا سے نہیں ہوئی بلکہ اس نے صحت دی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسی چیز کا اعلان کیا تھا کہ وہی کھلاتا ہے، وہی پلاتا ہے اور بیمار پڑ جاؤں تو وہی شفا دیتا ہے۔ **وَالَّذِیْ ھُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ oوَاِذَا مَرِضْتُ فَھُوَ یَشْفِیْنِ o**(الشعراء ۲۶:۷۹-۸۰)''جو مجھے کھلاتا ہے اور پلاتا ہے اور جب بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی شفا دیتا ہے''۔ اسی طرح اگر آنکھ دیکھتی ہے تو اس کے دکھانے سے دیکھتی ہے، کان سنتا ہے تو اس کے سنانے سے سنتا ہے، جیب میں پیسہ آتا ہے تو اس کے دینے سے آتا ہے۔ نیز یہ پہلو کہ وہ راستہ کیوں اختیار کیا جائے جو اسے ناپسند ہے، آنکھ وہ چیز کیوں دیکھے جسے وہ نہیں دکھانا چاہتا، اور وہ چیز کیوں نہ دیکھی جائے جس کو وہ چاہتا ہے کہ آنکھ اس پر جمی رہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر تمام تر اطاعت، محبت اور شکر کا انحصار ہے۔ اگرچہ اس کا تعلق، تعلق باللہ سے ہے مگر یہ اس چیز کا سرچشمہ ہے کہ جو کچھ کر رہا ہے وہ کر رہا ہے، جو دے رہا ہے وہ دے رہا ہے، اور اگر کسی کا حکم چل رہا ہے تو اسی کا حکم چل رہا ہے۔ چونکہ سارے اسباب

پردے میں ہیں اور نگاہ پردوں میں الجھ کر رہ جاتی ہے، نتیجتاً آدمی شرک میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

انبیا ان پردوں کو چاک کر دیتے ہیں اور غیب کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ پھر آدمی پردے کے پیچھے بھی آج ہی وہ دیکھ لیتا ہے جو کل موت کے بعد نظر آئے گا۔ وہ آج ہی دیکھ لیتا ہے کہ ہاں، وہ ہستی وہاں بیٹھی ہوئی ہے۔ سب کچھ اسی کے حکم سے ہو رہا ہے۔ پانی بادلوں سے نہیں برس رہا، وہ برسا رہا ہے۔ سب کچھ اسی کے حکم سے ہو رہا ہے۔ کس نے کھیتی اگائی اور کس نے آسمانوں سے پانی اتارا، تم نے یا ہم نے؟ قرآن یہ سوال بار بار کرتا ہے تاکہ دل کے اندر یہ بات جڑ پکڑ جائے کہ ظاہری اسباب کچھ بھی ہوں لیکن حکم صرف اللہ کا چلتا ہے۔ اس سے محبت اور جذبہ شکر بھی پیدا ہوگا، اطاعت اور نافرمانی سے بھی آدمی بچے گا۔

قرآن نے ابتدا ہی سے ان دو چیزوں کی تاکید کی اور اسی پر اپنا پورا زور رکھا۔ جیسے جیسے یہ سوچ پختہ ہوتی گئی تو دیگر مطالبات پورے ہونے کی بنیاد بھی بنتی چلی گئی۔ اگر یہ پہلو کمزور ہو تو آدمی خواہ کتنے ہی اصول وضوابط بنا لے، کتنے ہی احکامات جاری کر دے اور مطالبات پیش کر لے مگر وہ قوت پیدا نہیں ہو سکتی جس سے دنیا زیرِنگیں ہو جائے۔ دنیا تو اس وقت زیرِنگیں ہوگی جب آدمی اپنے خالق کا صحیح معنوں میں ''حنیف'' بن جائے۔ ''حنیفیت'' کی یہ صفت توحید سے حاصل ہوگی۔ لاحول ولاقوۃ، یہ عرش کا خزانہ ہے۔ پوری کائنات میں کوئی چیز اللہ کے دائرے سے باہر نہیں۔ اس کی ''کرسی'' میں زمین وآسمان سب سمائے ہوئے ہیں۔

اس پختہ سوچ، یقین اور تصور کے ساتھ جب آپ دعوت کا کام کریں گے، لوگوں کے پاس جائیں گے، دعوت دیں گے، ان کو جمع کریں گے تو نفس کے فتنوں، شہرت کی طلب، کبر اور دعوت کے دیگر خطرات سے آپ بڑی حد تک محفوظ ہو جائیں گے۔ اس بات کی ضمانت تو نہیں دی جاسکتی کہ شیطان وسوسے نہیں ڈالے گا اور دل میں وسوسے نہیں پیدا ہوں گے اور خیالات نہیں آئیں گے۔ اس بات کی کوئی بھی ضمانت نہیں دے سکتا۔ یہ ایک لحاظ سے آزمایش کے لیے ضروری بھی ہیں، لیکن یہ کہ پھر آپ کی حیثیت ایک مضبوط قلعے کے اندر محفوظ فرد کی سی ہوگی اور اس کے

اندر آپ فوراً بچاؤ کر لیں گے۔ پھر آپ آگے بڑھ کر بڑے بڑے خطرات مول لے سکیں گے، ان سے ڈر کے اور کانپ کے کسی گوشے میں نہیں بیٹھے رہیں گے۔ پھر آپ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح رسی کے سانپ دیکھ کر نہیں ڈر جائیں گے، آپ کے پاس تو عصائے موسیٰ علیہ السلام ہوگا، وہ اژدہا بن کر ان سارے وسوسوں اور خدشات و خطرات کو نگل جائے گا۔ پھر آپ اپنے مقام پر کھڑے ہو کر یہ سارا کام کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے ایسی ہی عاجزی، تواضع و انکساری اور بندگی اور اعتصام باللہ و حنیفیت درکار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس بات کی اہمیت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے بار بار اس کی تاکید فرمائی ہے:

وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ (اٰل عمرٰن ۳:۱۰۳) سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو۔

وَمَنۡ يَّعۡتَصِمۡ بِاللّٰهِ فَقَدۡ هُدِىَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ (اٰل عمرٰن ۳:۱۰۱) جو اللہ کا دامن مضبوطی کے ساتھ تھامے گا وہ ضرور راہ راست پا لے گا۔

اللہ نے ہدایت کے لیے یومنون بالغیب (ایمان بالغیب) سے آغاز کیا اور قل ھو اللہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ کہو کہ اللہ ایک ہے، اس جیسا کوئی نہیں ہے، وہ بے نیاز ہے اور اسب اس کے محتاج ہیں۔ پھر سورہ اخلاص کو بار بار دہرانے کی تاکید کی گئی ہے کہ اسے فجر کی نماز میں پڑھو، مغرب کی نماز میں سنتوں میں پڑھو، غرض سورہ فاتحہ اور سورہ اخلاص کو پڑھنے کی بہت تاکید کی گئی ہے۔ یہ اس لیے کہ ان دونوں کے اندر اسی چیز کی تعلیم موجود ہے۔ جو بھی اس کو جتنا سمجھے گا، حاصل کرے گا اور جذب کرے گا، اتنا ہی اس کے اندر قوت پیدا ہوگی۔ اس میں کوئی ڈرنے کی بات نہیں ہے، اپنے آپ کو تیار کرنے کی بات ہے۔ تیاری بھی کسی گوشے میں بیٹھ کر نہیں ہوگی بلکہ میدان میں اتر کر ہوگی۔ اگر آپ سمجھ بوجھ رکھتے ہیں تو ان شاء اللہ ان کا مقابلہ کر سکیں گے۔

دعوت عام، انقلاب اور تبدیلی کے حوالے سے ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ ہم کوئی شارٹ کٹ چاہتے ہیں یا جلدی مچا رہے ہیں۔ اس بات کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ہم کوئی

شارٹ کٹ یا جلدی نہیں مچانا چاہتے۔ اس لیے کہ سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر وہ جلد تبدیلی لانا چاہے گا تو کوئی شارٹ کٹ کی صورت پیدا کر دے گا اور اگر لانگ کٹ کرنا چاہے گا تو لانگ کٹ کر دے گا۔ یقیناً ہماری خواہش یہی ہے اور ہونی چاہیے کہ دین آج ہی نافذ ہوجائے لیکن اس کے لیے ہم اللہ کی نافرمانی نہیں کر سکتے، بغاوت نہیں کر سکتے۔ اگر دیر ہے تو انتظار کرنا ہوگا اور اگر اللہ کو جلد منظور ہوا تو خود کوئی راستہ نکال دے گا۔ تاہم دعوت کے لیے ہم ہر موثر ذریعہ اور طریقہ ضرور اپنائیں گے اور راضی بہ رضا رہیں گے۔

اگر ہم لوگوں کو اللہ کی طرف، اعتصام باللہ کی طرف اور حنیف بن کر حنیفیت کی طرف دعوت دیں تو پھر عوام کے دلوں کے راستے بھی کھلیں گے، ان کے اندر استعداد اور قوت بھی پیدا ہوگی اور وہ ساتھ بھی آئیں گے نیز ان خطرات سے بھی محفوظ رہیں گے جو خطرات ''طریقۂ نبوت'' میں ہیں اور جن سے بچنے کے لیے لوگوں نے ''طریقۂ ولایت'' اختیار کیا۔

بلاشبہ نبوت کا راستہ بڑا مشکل راستہ ہے کہ دنیا میں بھی رہو اور دنیا سے بے نیاز بھی رہو۔ اس سے مشکل آزمایش اور کیا ہوسکتی ہے۔ دنیا سے کٹ کے آدمی دنیا سے بے نیاز ہوسکتا ہے مگر دنیا میں سر سے پاؤں تک غرق ہو اور پھر بھی دنیا سے کوئی تعلق نہ رکھے، اور اللہ کا ہو رہے، یہ بہت مشکل کام ہے۔ یہ تو اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ جب آدمی سارے اسباب کے پردے چاک کر دے، سبب کو رب نہ بنائے بلکہ اسی ایک کو رب بنائے جو سارے کائنات کا رب ہے۔ یہ وہ بنیادی سوچ اور فکر ہے جو اس راہ میں چلتے ہوئے ہمارے لیے ناگزیر ہے۔ پہلے ہی قدم پر اس کو سمجھنا اور خوب جان کر آگے بڑھنا بہت ضروری ہے۔

لوگوں میں یہ ایک عام تاثر پایا جاتا ہے کہ دین مشکل ہے۔ اس پر چلنا محال ہے۔ یہ بہت نیک، پارسا اور متقی لوگوں کا کام ہے، عام آدمی کے بس کی بات نہیں۔ دعوت عام کے حوالے سے اس غلط تصور کو دور کرنے کی ضرورت ہے۔ درحقیقت دین آسان ہے، انسان کی فطرت کے مطابق ہے، اور ہمارے تمام مسائل کا حل دین ہی میں ہے۔ یہ دعوت دین کی

بنیادوں میں سے ایک اہم بنیاد ہے۔

دین آسان ہے

اللہ تعالیٰ نے دین آسان بنایا ہے۔ آغاز میں دین کا نام ''اسلام'' معروف نہیں تھا۔ یہ بعد میں قرآن میں نازل ہوا اور لوگوں نے اس کو اختیار کیا۔ شروع میں اس کا نام ''الخیر'' تھا۔ اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ دین مرد وعورت، بچے اور بوڑھے، پڑھے لکھے اور اَن پڑھ، ہر انسان کے لیے ہے تو دین کا کوئی ضروری مطالبہ ایسا نہیں ہوسکتا جو عقلی و منطقی طور پر عام آدمی کے بس میں نہ ہو۔ اگر اللہ تعالیٰ کوئی ایسا مطالبہ کرے جو عام آدمی کے بس سے باہر ہو، جس کے معنی ہیں کہ وہ آدمی اس کو پورا نہیں کرسکتا، تو یہ خلاف انصاف ہوگا۔ قرآن میں آتا ہے: **لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا**ؕ (البقرہ ۲:۲۸۶) ''اللہ کسی کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا''۔ لہٰذا دین کے مطالبات کسی عام انسان، مرد وعورت، بچے اور بوڑھے کی وسعت سے باہر نہیں ہو سکتے۔ تمام علما اسی آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ جب اللہ نے دین کو لازم کیا ہے تو یہ آسان ہونا چاہیے، مشکل نہیں ہوسکتا۔ یہی میرا نقطۂ نظر ہے کہ اگر قرب الٰہی اللہ کو مطلوب ہے تو یہ راستہ مشکل نہیں ہوسکتا۔

یہ بات واقعتاً صحیح ہے کہ جو بات بھی اللہ نے لازم کی ہے وہ مشکل نہیں ہوسکتی۔ اللہ نے بار بار کہا ہے کہ ہم آسانی چاہتے ہیں، مشکل نہیں چاہتے ہیں۔ انسان ضعیف، کمزور اور عجلت پسند ہے۔ ہم نے احکام کو ہلکا کر دیا ہے۔ ابتدائی دور میں رات کی نماز میں تہجد کے دو نفل مشکل ہوئے تو پانچ وقت کی نماز فرض کر دی۔ ایک مسلمان کو ۱۰ کے مقابلے میں لڑنے کا حکم تھا، اس کو آسان کر دیا۔ جب وراثت کے احکام آئے تو اللہ نے کہا: **یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ** (البقرہ ۲:۱۸۵) ''اللہ تعالیٰ تمھارے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے''۔ جب اللہ تعالیٰ آسانی چاہتا ہے تو پھر بندوں کو دین کو مشکل بنانے کا حق کہاں سے پہنچتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو مطالبات جیسے رکھے ہیں ان کو اسی درجے میں رکھنا اور اسی مقام پر رکھنا، یہ لازمی اور ناگزیر ہے۔

دین کو اتنا مشکل بنانا کہ عام آدمی اس کا بوجھ نہ اٹھا سکے، یہ حضورﷺ کا راستہ نہیں تھا۔ حضورﷺ کا راستہ تو دین کو آسان اور ہلکا بنا کر پیش کرنا تھا۔ چند مثالیں پیش کروں گا جن سے اندازہ ہوگا کہ کیسے ایک عام آدمی دین کا بوجھ اٹھا سکتا ہے، اور اپنی خرابیوں، کمزوریوں، لاچاریوں اور ضعف کے باوجود اس پر چل سکتا ہے۔ ہم دین کے دائرے میں رہ کے ان کے لیے سہولت پیدا کریں، یہ ہمارا طریقہ ہونا چاہیے۔

قرآن مجید کی آیت فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلۡيُسۡرٰى (الیل ۹۲:۷) کا ترجمہ یہ نہیں ہے کہ ہم راستے کو اس کے لیے آسان کر دیں گے بلکہ اس کا ترجمہ یہ ہے کہ ''اس کو ہم آسان راستے کے لیے سہولت دیں گے''۔ اس پر غور کریں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ راستہ تو ہے ہی آسان، یہ تو آدمی کی فطرت کی کجی اور اس کا ٹیڑھ پن ہے جو راستے کو مشکل بنا دیتا ہے۔ یعنی ہم اس کو، اس کی فطرت کو، اس کی طبیعت کو، اس راستے کے لیے آسان کر دیں گے۔ گویا دین کا راستہ آسان ہے، اس میں کوئی مشکل نہیں ہے۔ اللہ کی طرف چلنا، اس تک پہنچنا، اس کی مرضی پوری کرنا اگر اتنا مشکل کام ہوتا تو وہ ہم سے مطالبہ ہی نہ کرتا۔

اللہ نے دین کو آسان کرنے کا نسخہ بھی بتایا ہے۔ یہ نسخہ کوئی بہت مشکل نسخہ نہیں ہے بلکہ آسان ہے۔ سورہ البقرہ کے آخری رکوع میں ایک دعا ہے:

رَبَّنَا وَلَا تَحۡمِلۡ عَلَيۡنَآ اِصۡرًا كَمَا حَمَلۡتَهٗ عَلَى الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِنَا ۚ (البقرہ ۲:۲۸۶) مالک ہم پر بوجھ نہ ڈال، جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالے تھے۔

مفسرین کے نزدیک ''اصرا'' کے معنی بیڑی اور بوجھ کے ہوتے ہیں۔ اس سے دین کے مسائل کا وہ بوجھ مراد ہے جو بنی اسرائیل نے اپنی قوم پر مختلف پابندیوں کی صورت میں ڈال دیا تھا۔ نبی یہ بوجھ اتارنے کے لیے آتے تھے۔ یہ زنجیریں اور بیڑیاں وہ ہیں جن کے بارے میں فرمایا: يَاۡمُرُهُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ يَنۡهٰهُمۡ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيۡهِمُ الۡخَبٰٓئِثَ وَ يَضَعُ عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَ الۡاَغۡلٰلَ الَّتِىۡ كَانَتۡ عَلَيۡهِمۡ ؕ

(الاعـــراف ۷:۱۵۷)''وہ انھیں نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے، ان کے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے، اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے''۔

تدریج کا عمل

دین کے چند اصول ہیں جن میں ایک تدریج ہے۔

دعوت عام کے حوالے سے تدریج کا اصول اہم اصول ہے۔ اس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ دین میں سارے اعمال ایک درجے کے نہیں ہیں۔ ہمارے فقہا نے اس تدریج کو اچھی طرح واضح کر دیا ہے۔ فرائض اور سنن، سنت موکدہ اور سنت غیر موکدہ، نوافل اور مستحب، یہ دراصل ایک ترتیب ہے جو بڑی پُر حکمت اور دین کے بنیادی اصولوں پر مبنی ہے۔ گویا سارے اعمال ایک درجے کے نہیں ہیں۔ اگر سارے اعمال کو ایک درجے کا بناتا ہے تو وہ دین کو مشکل بناتا ہے۔ حضور ﷺ کی پوری سنت اور اسوہ یہی تھا کہ آپ ﷺ فرائض کا مطالبہ پہلے کرتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ دین کے دوسرے تقاضے پیش کرتے تھے، اور باقی چیزوں کو جو مباح تھیں، ان میں آزاد چھوڑتے تھے۔

جب تدریج کا نظام خلط ملط ہو جاتا ہے تو پھر لوگوں کے لیے بوجھ اٹھانا مشکل ہو جاتا ہے۔ بنی اسرائیل کے علما نے یہی کیا تھا۔ نتیجتاً ایک کے بعد ایک، ایک کے بعد ایک، مسائل اتنے پیچیدہ ہوتے چلے گئے کہ عام آدمی کے لیے دین کی ذمہ داریاں نبھانا مشکل ہو گئیں۔ ان کے لیے دین ایک بوجھ بن گیا۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے انجیل میں بنی اسرائیل کے علما سے بڑے خوب صورت انداز میں مخاطب ہوتے ہوئے تقریر کی ہے کہ تم اپنے لیے مجلسوں میں اعلیٰ مقام چاہتے ہو، تم چاہتے ہو کہ تمھیں اونچی جگہ بٹھایا جائے، لوگ تمھارا لباس اٹھا کے تمھارے ساتھ ساتھ چلیں، تمھارے ساتھ مصافحے کریں مگر تم نے دین کو اتنا بوجھل بنا دیا کہ کوئی عام آدمی اس کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا، اور پھر تم انگلی بھی نہیں ہلاتے ہو کہ لوگوں کی مدد کرو تا کہ وہ دین کا بوجھ اٹھا سکیں۔

یہ تقریر انجیل میں موجود ہے۔ آج ہمارے ہاں بھی دین کی کچھ ایسی ہی حالت بنا دی گئی ہے۔

دین کے مطالبات میں حضور ﷺ نے تدریج کی حکمت کو پیش نظر رکھا ہے۔ ایک تدریج تو وہ ہے جو قرآن حکیم اور شریعت کے ساتھ نازل ہوئی۔ حضور ﷺ نے صرف کتاب اور احکام کی تعلیم نہیں دی تھی بلکہ حکمت کی تعلیم بھی دی تھی۔ کَمَآ اَرۡسَلۡنَا فِیۡکُمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡکُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡکُمۡ اٰیٰتِنَا وَ یُزَکِّیۡکُمۡ وَ یُعَلِّمُکُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ وَ یُعَلِّمُکُمۡ مَّا لَمۡ تَکُوۡنُوۡا تَعۡلَمُوۡنَ ۞ (البقرہ ۲:۱۵۱) ''ہم نے تمھارے درمیان تم میں سے ایک رسول بھیجا، جو تمھیں ہماری آیات سناتا ہے، تمھاری زندگیوں کو سنوارتا ہے، تمھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، اور تمھیں وہ باتیں سکھاتا ہے، جو تم نہ جانتے تھے''۔ آپ ﷺ کی اس تعلیم کتاب وحکمت میں تدریج کا پہلو ایک بہت بڑی حکمت ہے۔

تدریج کے مختلف پہلو

ایک موقع پر جب آپ ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف بھیجا تو آپ ﷺ نے انھیں چند ہدایات دیں۔ اس میں ایک تدریج تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ تم پہلے ان کو ایمان کی دعوت دینا۔ جب وہ اسے مان لیں تو بتانا کہ زکوٰۃ بھی فرض ہے۔ جب وہ اسے مان لیں تو ان کو دین کے دوسرے فرائض بتانا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: آسانی پیدا کرنا، تنگی مت پیدا کرنا، اور خوشخبری دینا، اور لوگوں کو دین سے مت بھگانا۔ یہاں آپ ﷺ نے خود تدریج کا حکم واضح کیا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ شراب کی بندش کا حکم تین مراحل میں آیا۔ پہلے مرحلے میں یہ حکم آیا کہ شراب کے نقصانات زیادہ ہیں۔ اس طرح سے لوگوں کو نقصان کی طرف توجہ دلائی گئی اور شراب کی حرمت کا اشارہ دیا گیا۔ دوسرے مرحلے میں یہ حکم آیا کہ نشے کی حالت میں نماز مت پڑھا کرو۔ اس طرح بے شمار لوگوں نے اشارہ پا لیا۔ لیکن غزوۂ اُحد تک حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور بڑے بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین شراب پیا کرتے تھے۔ اس کی روایات موجود ہیں۔

اس کے بعد حکم آیا کہ شراب حرام ہے، رک جاؤ تو سب رک گئے۔ اس تدریج سے یہ حکم نافذ ہوا۔ اس کے بعد وہ جو بات کہتی ہیں بڑی قابل قدر ہے کہ اگر پہلی دفعہ میں حکم آتا کہ رک جاؤ تو لوگ ماننے سے انکار کر دیتے۔ یہ وہ لوگ تھے جو حضور ﷺ کے ساتھ چل رہے تھے، آپ ﷺ پر ایمان لائے تھے، جنھوں نے آپ ﷺ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر بیعت کی تھی۔ ان کے بارے میں وہ کہہ رہی ہیں کہ وہ ماننے سے انکار کر دیتے۔ یہ تدریج کے اصول کی ایک عمدہ مثال ہے۔

دین میں تدریج کے پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ رضی اللہ عنہ نے ۱۰، ۱۱ باتیں گنوائی ہیں۔ مثال کے طور پر انھوں نے کہا کہ لوگوں کی فطرت میں تفریح کا ذوق بھی ہے۔ اس لیے دین میں جمعہ اور عیدین کے موقع پر اچھے کپڑے پہننے اور خوشبو لگانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی طرح خوشی کے موقع پر دف بجانے کی اجازت دی گئی۔ نبی کریم ﷺ نے خود عید کے موقع پر لڑکیوں کو گانے اور دف بجانے کے لیے کہا کہ آج تو عید کا دن ہے، خوشی کا دن ہے۔ اس طرح شریعت کی حدود میں جتنی گنجایش ہوسکتی تھی آنحضور ﷺ نے خود رکھی۔

لوگ فطرتاً حسن کو پسند کرتے ہیں۔ اس لیے بدصورت آدمی کی امامت کو آپ ﷺ نے پسند نہیں کیا لوگ اپنے قبیلے کے آدمی کے پیچھے چلنا چاہتے ہیں اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ باہر کا امام مقامی امام کو ہٹا کر امام نہ بنے۔ ایک بار آپ ﷺ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ خانہ کعبہ سنت ابراہیم علیہ السلام پر قائم نہیں ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس کو دوبارہ توڑ کے ابراہیمی بنیاد پر قائم کروں۔ پھر ایک دروازہ آنے کے لیے اور ایک دروازہ نکلنے کے لیے بناؤں۔ پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ تمھاری قوم اس کو پسند نہیں کرے گی، ابھی ابھی مومن ہوئے ہیں، اس لیے میں نہیں کرتا۔ یوں آپ ﷺ نے ارادہ ترک فرما دیا۔

نبی کریم ﷺ کا ایک اصول تھا کہ دین کا نفاذ چھوٹی چھوٹی باتوں کے بجائے بنیادی باتوں سے کیا جائے۔ احادیث میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ ان سب مثالوں سے کچھ اصول نکلتے ہیں۔

مثال کے طور پر آپ ﷺ نے نماز میں طویل قرأت سے منع فرمایا ہے۔ ایک جگہ حضرت معاذ بن جبل ؓ جا کر نماز پڑھاتے تھے۔ وہ جاتے ہی سورہ البقرہ شروع کر دیتے تھے۔ نماز میں مزدور اور کسان شریک ہوتے تھے۔ وہ لوگ دن بھر کی محنت مزدوری سے تھکے ہوتے تھے۔ ان کے لیے لمبی نماز پڑھنا مشکل تھی۔ انھوں نے نماز پڑھنا چھوڑ دی؟ انھوں نے کہا کہ ہم دن بھر کی مزدوری سے تھکے ہارے آتے ہیں اور یہ لمبی لمبی قرأت کرتے ہیں۔ ہم نہیں سن سکتے۔ آج اگر کوئی یہ بات کہے تو علما فتویٰ جاری کر دیں کہ تم کیسے مسلمان ہو، قرآن نہیں سن سکتے۔ حضور ﷺ نے ناراضی کا اظہار کیا اور حضرت معاذ بن جبل ؓ سے یہ کہا کہ دیکھو لوگوں کو متنفر مت کرو۔ سورہ الضحیٰ، الم نشرح، واللیل، چھوٹی چھوٹی سورتیں پڑھو۔ لمبی سورتیں مت پڑھو۔

نبی کریم ﷺ نے ہر جگہ اس حکمت کو ملحوظ رکھا کہ لوگ فرائض کے پابند رہیں اور دیگر مطالبات میں ایک تدریج رکھی۔ نبی کریم ﷺ کے پاس جو وفود قبول اسلام کے لیے آتے تھے، آپ ﷺ نے ان کے ساتھ کس حکمت کی تدریج کے اصول کو استعمال کیا وہ قابل غور ہے۔ ایک موقع پر ایک آدمی نے آ کر پوچھا کہ دین کیا ہے؟ اس نے بڑے تفصیلی سوال کیے۔ بڑا پیارا انداز تھا۔ اس نے کہا کہ آپ ﷺ کو نبی بنا کر بھیجا گیا ہے، کیا آپ ﷺ قسم کھا سکتے ہیں؟ آپ ﷺ نے کسی ناراضی کا اظہار نہ کیا۔ پھر اسے دین کے چند احکامات کے اتباع کے لیے کہا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ بدو تھا اس سے اتنا ہی مطالبہ ہو سکتا تھا۔ مگر سب سے یہ مطالبہ نہیں تھا۔ اسی طرح قبیلہ ثقیف شراب نوشی کے لیے بڑا معروف تھا۔ قبیلے کے لوگوں نے کہا کہ ہم سرد ملک میں رہتے ہیں، طائف میں بڑی سردی پڑتی ہے، ہمیں شراب پینے کی اجازت دی جائے۔ آپ ﷺ نے منع کر دیا لیکن وہ شراب پیتے رہے۔ حضور ﷺ نے تدریج کی حکمت اپنائی، یہاں تک کہ انھوں نے شراب نوشی ترک کر دی۔

ایک صحابی حضرت ابو محجن ثقفی ؓ تھے جن پر شراب پینے کی وجہ سے کئی دفعہ حد نافذ ہو چکی تھی مگر پھر شراب پی لیتے تھے۔ ایک جنگ کے موقع پر انھوں نے شراب پی تو حضرت سعد

بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے ان کو بیڑیاں پہنا کر قید کر دیا اور ان پر حد جاری کی۔ معرکہ چھڑا تو مسلمانوں کے اوپر مصیبت پڑ گئی۔ انھوں نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی بیوی سے کہا کہ آپ میری بیڑیاں کھول دیں اور گھوڑا دے دیں۔ پہلے تو وہ ہچکچائیں کہ قیدی ہے، شرابی ہے، میں اسے کیسے چھوڑ دوں۔ بالآخر انھوں نے ان کی بیڑیاں کھول دیں اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا اپنا گھوڑا انھیں دے دیا۔ وہ بیمار تھے اور پیچھے سے بیٹھے کمانڈ کر رہے تھے۔ حضرت ثقفی رضی اللہ عنہ گھوڑے پر سوار ہوئے اور وہ داد شجاعت دی کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ حیرت سے دیکھتے رہ گئے کہ گھوڑے پہ یہ کون سوار ہے کہ جس نے صفیں کی صفیں پلٹ دیں۔ جب جہاد ختم ہو گیا تو وہ واپس آئے، گھوڑا واپس کیا، بیڑیاں پہنیں اور پھر بیٹھ گئے۔ بعد میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ آئے، پوچھا یہ کون تھے؟ ان کی بیوی نے کہا وہ یہ تھے۔ اس پر انھوں نے ان سے حد معاف کر دی۔ ہمارے علما کا تقریباً اجماع ہے کہ جہاد کے زمانے میں حدود نافذ نہیں ہونی چاہییں۔ حدود نافذ ہونے سے لوگ برگشتہ ہوں گے اور دشمن سے مل سکتے ہیں۔ ان کے سامنے دین کے لیے مصلحتیں اور حکمتیں تھیں۔ وہ لکیر کے فقیر نہیں تھے اور دین کے وفادار تھے۔ وہ جانتے تھے کہ انسانی معاشرے میں مصلحت کے ساتھ دین کو آسان بنا کے لوگوں کو مجتمع کرنا اور قوت بنانا ضروری ہے۔ اسی کے نتیجے میں انھوں نے انسانوں کی ایک قوت جمع کر لی۔ وہ سب مختلف رنگ و نسل کے لوگ تھے لیکن جہاد کے مقصد کے لیے جمع ہو گئے۔ ۱۰۰ برس کے عرصے میں وہ سندھ، بلوچستان، مصر، شام، لیبیا، الجزائر، سمرقند اور بخارا اور کہاں کہاں نہیں پہنچ گئے!

ان مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ تدریج کا اصول ہی ہے کہ جس پر عام لوگ جمع ہو سکتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ دین کو حکمت کے ساتھ لے کر چلا جائے اور لوگوں سے وہ مطالبات کیے جائیں جو وہ پورے کر سکیں۔ ان پر آہستہ آہستہ بوجھ ڈالا جائے اور بہ تدریج دین کے مطالبات پورے کرنے کا تقاضا کیا جائے۔ اسی طرح سے جس طرح ایک پہلوان اپنی قوت و طاقت کے لحاظ سے ورزش کرتا ہے اور بہ تدریج اس میں اضافہ کرتا ہے۔ یہ نہیں کہ پہلے ہی دن ۱۰۰ ڈنڈ پیلو اور ۱۰۰ دفعہ اٹھک بیٹھک کرو بلکہ پہلے دن اگر ایک کر سکتا ہے

تو ایک کرے، اور دوسرے دن دو کر سکتا ہے تو دو کرے۔

حکمت اور مصلحت، دین کے اثرات کو بڑھانے کے لیے ناگزیر اور ضروری ہے۔ اس کے بغیر عام لوگوں کو ساتھ نہیں لیا جا سکتا بلکہ وہ متنفر ہو سکتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ لوگ نعروں کے بل پر، ظلم کے خلاف، سرمایہ دار اور جاگیردار کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ یہ حقوق کی جنگ ہوگی اور ہمیں یہ کام بھی کرنا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے اندر دین کی روح بھی پیدا کرنا ہوگی جو اصل چیز ہے۔ دینی روح پیدا کرنے کے لیے تدریج اور حکمت و مصلحت کا اصول ہمیشہ پیش نظر رکھنا ہوگا۔

مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے حکمت کے اسی پہلو کو ایک جگہ بڑے خوب صورت انداز میں واضح کیا ہے کہ ہم دین میں کوئی ترمیم نہیں کر سکتے۔ جو دین میں مطلوب ہے اس کو ہم دین میں مطلوب ہی بتائیں گے، اور جو دین میں منع ہے اس کو منع ہی بتائیں گے لیکن کسی وقت قوم کی استعداد دیکھ کر ان میں سے کسی چیز پر ہم زور دیں گے اور کسی پر نہیں دیں گے، یہ حکمت کا تقاضا ہے۔ انھوں نے بہت واضح طور پر بیان کیا ہے کہ تقدیم، تاخیر یا ترجیحات کا نظام ہم حکمت سے قائم کریں گے۔ اسی طرح دین نافذ ہوسکتا ہے۔ اگر ہم چاہیں کہ معاشرے میں جو عام چھوٹی چھوٹی برائیاں ہیں ان کے پیچھے لٹھ لے کر پڑ جائیں تو یہ مناسب نہیں ہوگا۔ ہمیں کام کا آغاز بنیاد سے کرنا ہوگا۔ اس کے بعد ایک حکمت کے تحت بہ تدریج اقدامات اٹھانا ہوں گے۔

اس خدشے کے پیش نظر کہ دین میں آسانی سے دنیا پرست فائدہ اٹھا لیں گے یا فتنہ برپا کر دیں گے، ہم یہ دروازہ ہی بند کر دیں تو اسے دین محدود ہو جائے گا۔ دین کے ساتھ المیہ ہی یہ ہوا کہ اسے محدود کر کے رکھ دیا گیا اور بالآخر عملی زندگی سے خارج ہو کر یہ مدرسوں اور گوشوں کے اندر محدود ہو کر رہ گیا۔ ان خدشات کی بنیاد پر مختلف فتوے دیے گئے۔ لیکن ہمیں تو ان اصولوں کی پابندی کرنا ہے۔ جو اصولوں کا غلط استعمال کریں گے ہم ان سے کہیں گے کہ وہ غلط استعمال کر رہے ہیں۔ دین نے ہمیں جو بڑے اہم اصول دیے ہیں، ہم انھیں نہیں چھوڑ سکتے۔

شریعت میں کمی بیشی کا حق کسی کو حاصل نہیں ہے۔

ترجیحات کا پہلو

قرآن مجید کی پوری تعلیم یہ ہے کہ پہلے بنیادی باتوں کی تعلیم دی جانی چاہیے۔ بنیادی باتوں کی تعلیم کے بعد ہی اس پر دین کی عمارت تعمیر ہوسکتی ہے۔ قرآن مجید کی ابتدائی سورتوں کو پڑھا جائے تو ان میں احکام کی کوئی تفصیل نہیں ملتی بلکہ وہ اصول جو دین اور ایمان کے اہداف ہیں، وہ بیان کیے گئے ہیں۔

ایک جگہ اس طرح سے تعلیم دی گئی: فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی o وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی o فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰی o (الیل ۹۲:۵۔۷) ''جس نے (راہ خدا میں) مال دیا اور (خدا کی نافرمانی سے) پرہیز کیا، اور بھلائی کو سچ مانا، اس کو ہم آسان راستے کے لیے سہولت دیں گے''۔ بس تین باتیں اور کچھ نہیں، یعنی جس نے راہ خدا میں مال خرچ کیا، گناہوں سے بچا اور بھلائی کو سچ مانا۔ یہ بھی نہیں کہا کہ کس نے دیا، کتنا دیا، کس کو دیا اور کس کو نہیں دیا اور نہ یہ کہا کہ کہاں سے دیا؟ اصل چیز تو فیاضی ہے اور دینے کا جذبہ ہے۔ یہ پیدا ہو جائے تو بہت سے کام ہو جائیں گے۔ دل تنگ رہے گا تو بہت سے کام نہیں ہوں گے۔ اس لیے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے کہ ہر چیز خدا کی امانت ہے، ہر چیز دینا ہے، وقت، مال اور یہاں تک کہ وقت پڑنے پر جان بھی۔ یہاں نیکی کے لیے حسنٰی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی بڑی خوب صورت اور بڑی پیاری چیز کے ہیں۔ نیکی کوئی بدصورت چیز نہیں ہے کہ آدمی اس سے متنفر ہو۔ اس طرح اللہ کی راہ میں دین کی دعوت اور تعلیم مختصراً دی اور بات ختم کر دی گئی۔ ایک دوسرے مقام پر اس طرح تعلیم دی: وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰی oفَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰی (النازعات ۷۹:۴۰۔۴۱) ''اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا تھا اور نفس کو بری خواہشات سے باز رکھا تھا، جنت اس کا ٹھکانا ہوگی''۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں کہا گیا۔

یہ چیزیں ذہن میں بیٹھتی چلی گئیں اور پھر ان پر شریعت کی عمارت تعمیر ہوئی۔ ان تعلیمات سے اللہ کے ساتھ تعلق پیدا ہوا۔ اگر ہم ان دو چیزوں کو یعنی اللہ کا خوف اور تقویٰ کو نظر انداز کریں گے اور محض ظاہری مطالبات کریں گے تو لوگوں کے اندر کوئی استعداد پیدا نہیں ہوگی اور نہ ہی ہماری اپنی استعداد سے کوئی معاشرہ قائم ہوگا۔ یہ اولین ترجیح ہونی چاہیے۔ پھر اس حقیقت کو سامنے رکھنا چاہیے کہ یہ ملک کروڑوں افراد کا ہے۔ یہ ایک بہت بڑی تعداد ہے۔ سب کے سب لوگ کبھی بھی دین دار نہیں ہو جائیں گے۔ ہر قسم کے لوگ رہیں گے، زانی بھی، شرابی بھی۔ لیکن ان کی بڑی اکثریت کو مجموعی طور پر بھلائی کی طرف آنا چاہیے اور ان چیزوں کو اختیار کرنا چاہیے۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوسکتا ہے کہ ہم ان بنیادی تعلیمات کی بنیاد پر دین کی پوری عمارت اٹھا سکیں۔ اس غرض کے لیے قرآن کی حکمت اور قرآن کا طریقہ تعلیم اور ترجیحات کا پہلو ہماری نگاہوں کے سامنے رہنا چاہیے۔

یہ بات بھی بار بار سامنے آتی رہتی ہے کہ ہم مسلمان معاشرے کے اندر کام کر رہے ہیں۔ اگرچہ لوگ بگڑے ہوئے ہیں، خراب ہیں لیکن ان میں کہیں نہ کہیں اسلام سے وابستگی پائی جاتی ہے۔ دل میں اسلام کے لیے جذبہ موجود ہے۔ چند افراد کے سوا کوئی بھی کھلم کھلا اسلام کا باغی نہیں ہے بلکہ اچھے اچھے باغی لوگوں کے دل میں بھی اسلام سے وابستگی کی کوئی نہ کوئی رمق ضرور پائی جاتی ہے جس کا وہ کبھی کبھار اظہار بھی کر دیتے ہیں۔ گویا لوگوں کی بڑی تعداد کے دل میں اسلام کے لیے ایک چنگاری موجود ہے۔ راکھ کے ڈھیر کے اندر چھپی ہوئی اس چنگاری کو کریدنا، اس کو نکالنا، اس سے کام لینا، یہ دراصل حکمت اور ترجیحات کا متقاضی ہے۔

ترجیحات کا یہ پہلو کتنا اہم ہے اس کا اندازہ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک واقعے سے بہ خوبی ہوسکتا ہے۔ وہ سنت کے بہت بڑے اتباع کرنے والوں میں سے تھے۔ **بہشتی زیور** اور ان کی دوسری کتابوں میں جگہ جگہ بدعت کی نشان دہی کی گئی ہے۔ انھوں نے ایک ایسی آبادی کی طرف مبلغ بھیجے جن کے نام بھی ہندوؤں کے سے تھے اور جہاں مسجدیں بھی نہیں تھیں۔

ان میں مسلمانوں والی کوئی چیز نہیں تھی۔ نماز بھی نہیں پڑھتے تھے، کلمہ بھی نہیں جانتے تھے۔ گویا ہر لحاظ سے انھیں کافر کہا جا سکتا تھا۔ مبلغین نے ان سے پوچھا کہ تم کاہے کے مسلمان ہو؟ کہنے لگے ہم ''تعزیے'' بناتے ہیں۔ یعنی ہم اس لیے مسلمان ہیں کہ ہم ''تعزیے'' بناتے ہیں۔ اب تو مبلغین بہت چکرائے۔ کہنے لگے کہ اب ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟ چنانچہ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو لکھ کر بھیجا گیا کہ ہماری رہنمائی فرمائیں۔ آپ نے فرمایا کہ ابھی ان کو یہ مت کہو کہ ''تعزیے'' بدعت ہیں۔ اس لیے کہ ان کا اسلام سے ربط ''تعزیے'' کی معرفت ہی ہے۔ اس ربط سے اگر تم نے انھیں کاٹ دیا تو یہ اسلام سے کٹ جائیں گے۔ پہلے ان کو ایمان کی تعلیم دو۔ اس کے بعد ان کو اسلام سکھاؤ اور جب وہ سیکھ جائیں تو پھر ان کو بتاؤ کہ ''تعزیے'' بدعت ہیں۔ انھیں چھوڑنا چاہیے۔ پھر وہ چھوڑ دیں گے۔

اسلام کا حکمت سے جو ربط ہے، اس کو پیش نظر رکھ کر اگر دعوت دی جائے تو جو لوگ کمزور، ضعیف، جاہل اور کمزور ایمان والے ہیں، ان میں قوت پیدا ہو جائے گی۔

اس وقت یہی مرحلہ ہمارے سامنے ہے اور دعوت کے اصولوں کا بھی یہی تقاضا ہے۔ خاص طور پر اس اصول کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے کہ ہمیں اللہ سے تعلق جوڑنا ہے اور سب کچھ اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ لوگوں کا کسی نہ کسی انداز میں اللہ سے تعلق بھی ہے۔ لوگ ماشاءاللہ، ان شاءاللہ کہتے ہیں، لاحول ولاقوۃ کی تسبیح پڑھتے ہیں۔ گویا لوگوں میں جذبہ پایا جاتا ہے اور کسی نہ کسی انداز میں عمل بھی ہے۔ بس ان کو سمجھانے کی ضرورت ہے کہ اس کے کیا معنی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ خود بھی دین کے ان اصولوں اور ترجیحات کو سیکھا جائے جن پر دین کی بنیاد ہے اور دوسروں کو بھی سکھایا جائے۔

حکمت کا یہ بھی تقاضا ہے کہ مسلمانوں کا، اس امت کا، دین اسلام سے جو بھی ربط قائم ہے اس کو استعمال کیا جائے، مزید بڑھایا جائے اور پھر اس بنیاد پر دین کی عمارت تعمیر کی جائے۔ اگر غلط ربط ہے تو اس کو فوراً نہیں کاٹ دینا چاہیے بلکہ اس وقت کاٹنا چاہیے جب اس کا متبادل

دوسرا ربط قائم ہو جائے۔ جب اصل ربط قائم ہو جائے گا تو اسے کاٹ دینے سے کوئی مسئلہ نہ ہوگا۔ اگر ابتدا ہی میں کاٹ دیا جائے تو وہ اسلام کی رسی سے ہی کٹ جائیں گے اور کفر کا فتویٰ لگ جائے گا۔ یہ اسلام نہیں ہے۔ حدیث میں ہے کہ جو لا الٰہ الا اللہ کہے وہ مسلمان ہے۔ جان کے خوف سے بھی اگر کوئی کہے تو وہ مسلمان ہے۔ بہت سی احادیث ہیں جن میں آپ ﷺ نے اس بات پر زور دیا ہے کہ کلمہ گو کی تکفیر نہیں کرنا چاہیے۔ ہر جگہ آپ ﷺ نے سہولت دی اور ہر جگہ آپ ﷺ نے معافی و درگزر کا راستہ اختیار کیا۔

وسعت نظر

ایک اور اہم پہلو وسعت نظر ہے۔

آپ نے یہ آیت بار بار پڑھی۔ لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ؕ (الحشر ۵۹:۲۰) ’’دوزخ میں جانے والے اور جنت میں جانے والے کبھی یکساں نہیں ہو سکتے‘‘۔ اس کے اگر یہ معنی لیے جائیں کہ آخرت میں دونوں کے ساتھ برابر سلوک نہیں ہوگا تو یہ بھی معنی ہیں لیکن ان معنوں میں گہرائی نہیں ہے۔ یہ بات تو ظاہر ہے کہ آخرت میں، جو جنت میں جائے گا وہ الگ معلوم ہوگا اور جو دوزخ میں جائے گا وہ الگ معلوم ہوگا۔ مگر میری اپنی فہم کی حد تک اس کا اطلاق دنیا میں بھی ہوتا ہے۔ دنیا میں جو اصحاب جنت ہیں، جنت میں جانے والے ہیں، وہ یہاں بھی الگ نظر آتے ہیں، اور جو اصحاب نار ہیں، جہنم میں جانے والے ہیں، وہ بھی یہاں الگ نظر آتے ہیں۔ اس دنیا کے اندر بھی دونوں برابر نہیں نظر آ سکتے۔ دونوں مختلف ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے جنت کی تعریف یوں کی ہے: وَ سَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ (اٰل عمرٰن ۳:۱۳۳) ’’دوڑ کر چلو اس راہ پر جو تمھارے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف جاتی ہے جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے‘‘۔ اس کے معنی ہیں کہ جو اس جنت کی طلب میں ہوگا جس کی وسعت میں زمین و آسمان سما جائیں، اس کا دل بھی اتنا ہی وسیع نہ ہونا چاہیے ورنہ جنت کہاں سماتی ہے۔ جنت تو پہلے دل میں سماتی ہے۔

جس کا دل اتنا وسیع ہو، نظر اتنی بلند نہ ہو وہ اس جنت کا حق دار کیسے بنے گا؟ جس کا دل وسیع ہوگا وہ اللّٰہ کے ایک ایک حکم پر عمل کرے گا۔ وہ مال بھی لٹائے گا، وقت بھی دے گا اور راہ خدا میں جان بھی دے گا۔ اگر لوگوں سے خطائیں ہوں گی تو انھیں معافی دے گا، اور غلط کاروں اور گناہ گاروں کو بھی ساتھ لے کر چلے گا۔ اسی لیے یہ بات واضح ہے کہ جو جنت چاہتا ہے وہ دنیا کے اندر اس لحاظ سے ممتاز ہوگا کہ اس کا سینہ اور دل وسیع ہوگا، نظر میں وسعت ہوگی، چھوٹی چھوٹی چیزوں پر نہیں جھگڑے گا بلکہ بڑی بڑی چیزوں سے اپنا تعلق رکھے گا، ان کو لے کر آگے بڑھے گا اور تمام انسانوں کو اپنے جلو میں سمیٹ کر چلے گا۔

اگر آپ غور کریں جہاں قرآن نے جنت کی طرف اس حوالے سے دعوت دی ہے کہ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضُ ، اس کے فوراً بعد یہ فرمایا: الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ط (اٰل عمرٰن ۳:۱۳۴) ''جو ہر حال میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں خواہ بدحال ہوں یا خوش حال، جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں''۔ گویا جن کے دل وسیع ہوں گے وہ مال بھی خرچ کریں گے، جان بھی دیں گے، شہید بھی ہوں گے، معاف بھی کریں گے، اور غصہ بھی پی جائیں گے۔ بعض دفعہ لوگ انتقام لینے کی غرض سے آدمی کو ذلیل کرنے پر تل جاتے ہیں۔ اس کے لیے سمندر کے برابر ظرف چاہیے کہ آدمی غصے کو پی جائے اور معاف کر دے۔ یہ وسیع القلبی اور وسعت نظری کے بغیر ممکن نہیں جو کہ اہل جنت کے اوصاف میں سے ہے۔

دوسروں کے قصور کو معاف کر دینے کے حوالے سے ایک اہم مثال غزوۂ احد کی ہے، جب فتح شکست میں بدل گئی۔ لوگوں نے اس موقع پر حضور ﷺ کے ساتھ کیا نہیں کیا۔ مگر یہاں بھی اللّٰہ نے یہی ہدایت دی: وَ اسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ج (اٰل عمرٰن ۳:۱۵۹) ''ان کے قصور معاف کر دو، ان کے حق میں دعاے مغفرت کرو اور دین کے کام میں ان کو بھی شریک مشورہ کرو''۔ یہ وہ لوگ تھے جو جہاد کے اندر پیچھے ہٹ گئے تھے اور آپ ﷺ کو چھوڑ کر چلے گئے تھے، نتیجتاً شکست ہوگئی تھی۔ مگر اس موقع پر بھی وسعت قلبی اور عفو و درگزر سے کام لینے

کی ہدایت کی گئی تھی۔ یہی وہ چیز تھی جس کی وجہ سے لوگ آپ ﷺ کے گرد بھیڑ کی طرح گروہ درگروہ جمع ہوگئے۔اسی بات کی طرف قرآن نے یوں اشارہ کیا ہے: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ (اٰل عمرٰن ۳:۱۵۹)''(اے پیغمبر ﷺ) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو''۔

لہٰذا جنت کی طلب کے معنی تو یہ ہوئے کہ دل ونظر میں وسعت ہو،عزائم اور حوصلے بلند ہوں، نہ کہ تنگ نظری کا مظاہرہ کیا جائے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں اور معمولی معمولی بحثوں میں الجھ کر نہ رہا جائے۔ان باتوں میں سے کسی کا تعلق بھی اس نئی تہذیب سے نہیں ہے جو دنیا میں تعمیر ہونے والی ہے۔وہ جماعت جو اس لیے کھڑی ہوئی ہو کہ وہ ساری دنیا کی امامت سنبھال کے ایک نئی تہذیب تعمیر کرے گی، اس کو کہاں فرصت ہوسکتی ہے کہ وہ ان چھوٹے چھوٹے مسائل میں تنگ نظری کا مظاہرہ کرتے ہوئے الجھی رہے۔اس جماعت کو تو وسیع النظر، وسیع القلب اور اپنی رائے کی قربانی جیسی صفات سے مزین ہونا چاہیے جو جنت کے طلب گاروں کا خاصا ہے۔

دعوت دین اور فریضہ اقامت دین کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ دعوت عام کا کام اعتصام باللہ، حنیفیت، دین میں آسانی، تدریج، ترجیحات اور وسعت نظر جیسی بنیادوں کو پیش نظر رکھ کر کیا جائے۔ جب اس وسعت قلبی اور وسعت نظری کے ساتھ آپ لوگوں کے پاس جائیں گے، دعوت عام دیں گے تو لوگ بھی ساتھ چلیں گے اور آیندہ کے مراحل بھی آسان ہوں گے۔ ان شاءاللہ! (کیسٹ سے تدوین: امجد عباسی)

❖ ❖ ❖